کچھ پوچھا اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ میں لپک کر کاؤنٹر پر گیا۔ "اشرف صاحب، یہ لڑکی کسے پوچھ رہی تھی؟"

"عظیم صاحب کو پوچھ رہی تھی۔ آج وہ آئے ہی نہیں۔"

میں اپنی جگہ پہ آ بیٹھا۔ مگر جب ایک اور لڑکی اسی طرح داخل ہو کر کاؤنٹر پہ اشرف صاحب سے بات کر کے چلی گئی تو میں پھر بے چین ہوا جا کر پھر اشرف صاحب سے پوچھا۔ "یہ لڑکی کسے پوچھ رہی تھی؟"

اشرف صاحب مجھے دیکھ کر ہنسے۔ "اخلاق صاحب، جب آپ والی لڑکی آئے گی تو میں اسے آپ کی طرف ڈائرکٹ کر دوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

میں بہت سٹپٹایا۔ "اشرف صاحب، میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔" پھر میں نے وضاحت کی "ہوا یہ کہ وہ ہمارے دفتر میں فون کرنے آئی تھی۔ میں تو اس وقت تھا بھی نہیں۔ وہ جاتے ہوئے اپنا پین بھول گئی۔ اصل میں اسے اپنا پین لینے کے لئے آنا ہے۔"

"ارے اخلاق صاحب، آپ تو صفائیاں پیش کرنے لگے۔"

"صفائی پیش نہیں کر رہا، بتا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ بیٹھے ہیں نا۔ وہ آئے گی تو مجھ ہی سے پوچھے گی۔ میں آپ کی طرف اسے ڈائرکٹ کر دوں گا۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے بے چینی سے اپنی گھڑی دیکھی۔ "لنچ ٹائم جا رہا ہے۔ مجھے آخر دفتر واپس جانا ہے۔ ابھی تک آئی ہی نہیں۔"

"کیا اُسے دور سے آنا ہے۔"

"اب یہ تو مجھے پتہ نہیں ـــــ ویسے دور ہی سے آ رہی ہو گی اور پھر اس وقت سواری بھی مشکل سے ملتی ہے۔" میں نے اس طرح اپنے آپ کو بھی سمجھایا اور واپس اپنی جگہ

آ بیٹھا اور اب میں ایک شک میں پڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں آئے گی بھی یا نہیں اور اس شک کے ساتھ میری بے چینی اور بڑھ گئی۔ اسی آن دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ مگر اس مرتبہ میں تھوڑا بور ہوا۔ اصل میں یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے بس سٹینڈ پر نظر آیا کرتی تھی۔ میں نے بیزار ہو کر سوچا کہ لو یہ یہاں بھی آن ٹپکی۔ اس نے کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کر اشرف صاحب سے کچھ پوچھا۔ انہوں نے اسی طرف اشارہ کیا جس طرف میں بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی میری سمت آئی۔ میں ایسے بن گیا۔ جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ پھر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے کہ واپس چلی گئی۔ پھر مجھے یونہی خیال آیا کہ آخر یہاں وہ کس سے ملنے آئی ہے۔ ہوگا اس کا بھی کوئی دلدادہ۔ جوان لڑکی کیسی بھی ہو، چاہنے والا کوئی نہ کوئی اُسے مل ہی جاتا ہے۔ یہ سوچ کر میں اسے ذہن سے رفع دفع کر دینا چاہتا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اشرف صاحب اُسے ساتھ لے کر میری طرف آ رہے ہیں۔ "دیکھئے یہ ہیں اخلاق صاحب"۔

"آپ" اس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا۔

"جی میں اخلاق ہوں" میں نے اپنی بیزاری کو چھپاتے ہوئے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

وہ سٹپٹائی "آپ اخلاق صاحب ہیں ـــــ اچھا آپ ہیں ـــــ میں سمجھ رہی تھی کہ"

"آپ کیا سمجھ رہی تھیں" میں نے اب کسی قدر ترشی سے جواب دیا۔

"دیکھئے بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ مجھے آپ سے بین لینا تھا"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی "بین۔ آپ کو بین لینا تھا۔ تو آپ ہیں۔

"جی"

"تشریف رکھیں"۔

وہ کسی قدر تامل کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ادھر وہ سٹپٹائی ہوئی تھی۔ اِدھر میں۔

"اچھا آپ کا وہ پین ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ

"جی آپ کیا سمجھ رہے تھے"

"کچھ نہیں" میں نے فوراً جیب سے پین نکالا اور پیش کر دیا "یہ لیجئے۔ آپ کا پین حاضر ہے"

اس نے قلم لیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تشریف رکھیں نا۔ کافی پیجئے"

"شکریہ۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں"

شام کو ممتاز ملا "سناؤ استاد کیا ہوا"

"یار بہت بُری ہوئی۔

"کیوں۔ نہیں آئی؟"

"آئی تو تھی"

"پھر؟"

"یار وہ تو وہی بور لڑکی تھی"

"کونسی بور لڑکی"

"وہی جس سے بس سٹینڈ پہ میری مڈھ بھیڑ ہوتی رہی ہے"

ممتاز نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا "اچھا وہ تھی۔ اچھا بتاؤ پھر کیا ہوا"

"میں نے اسے پین دیا اور چلتا کیا"

ممتاز ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا "چلتا کر دیا؟ کیا مطلب؟"

"ہاں ادھر میں اسے دیکھ کر سٹپٹایا۔ ادھر وہ بھی مجھے دیکھ کے سٹپٹا گئی۔ یہ سچوایشن دونوں ہی کے لئے خلافِ توقع تھی۔ میں نے پین اس کے حوالے کیا وہ چلی گئی"

"تو کوئی بات وات نہیں کی؟"

"اس سے کیا بات وات ہو سکتی تھی؟"

"کافی وافی سے تواضع کی ہوگی۔ آخر اس دوران کیا کرتے رہے؟"

"میں نے کافی کے لئے پوچھا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں جلدی میں ہوں۔ میں نے بھی سوچا کہ اب اسے جانے ہی دو۔"

ممتاز میری اس بات پہ بہت بے مزہ ہوا۔ "یار عجب گھامڑ آدمی ہو۔ اچھی بھلی آئی ہوئی لڑکی کو گنوا دیا۔"

"یار تمہارا کیا خیال ہے وہ لڑکی بور نہیں تھی؟"

"کونسی جس سے فون پہ تم لمبی لمبی باتیں کیا کرتے تھے؟"

"نہیں یار، وہ تو بہت سویٹ تھی۔ مگر جو بس سٹینڈ پہ میرے گلے پڑ گئی تھی۔"

"نادان آدمی، اب تو تجھے سمجھ آجانی چاہیے کہ لڑکی بیک وقت بور بھی ہوتی ہے سویٹ بھی ہوتی ہے۔ ویسے ایک بات میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔"

"کیا؟"

"تم پچھتاؤ گے۔"

"کیسے؟"

"بس میں نے کہہ دیا۔ لڑکی اس طرح سے آکر چلی جائے۔ آدمی کو یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ہوا کیا۔"

خیر اس وقت تو میں نے ممتاز کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ پھر ایک دو دن میں نے بس سٹینڈ کا رُخ ہی نہیں کیا۔ سوچا کہ نہ بس سے سفر کرو گے نہ اس سے مڈھ بھیڑ ہوگی۔ رکشا لیا اور سیدھے دفتر۔

بات جب ذرا آئی گئی ہو گئی تو میں نے سوچا کہ رکشا کا کرایہ کب تک بھرو گے۔

اپنی منی بس ہی ٹھیک ہے ایک دن، دو دن، تین دن، وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔ اب میرا تجسس بڑھنے لگا۔ روز وقت سے ذرا پہلے سٹینڈ پر پہنچ جاتا، وہاں کھڑی ہوئی مخلوق کا جائزہ لیتا اور حیران ہوتا کہ وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔

"یار ممتاز، وہ لڑکی تو غائب ہو گئی۔"

"کون لڑکی؟"

"یار وہی۔ اب وہ بس سٹینڈ پر نظر ہی نہیں آتی۔"

"فون بھی کوئی نہیں آتا ہے۔"

"نہیں۔ اس نے تو بالکل چپ سادھ لی۔"

"پھر پیارے وہ گئی۔"

"کامریڈ گیندے سے تمہارا مکالمہ ختم ہوا یا نہیں ہوا۔"

کامریڈ نے دھم سے آکر یادوں کے سارے سلسلہ کو درہم برہم کر دیا۔

"بھیا، میں نے تو پوری نیند لے لی۔"

"کامریڈ، گیندے سے نہیں، اس وقت میں اپنے آپ سے مکالمہ کر رہا تھا۔"

"اپنے آپ سے مکالمہ۔" کامریڈ نے مجھے اس وقت کتنی تحقیر سے دیکھا۔ "میں تم انٹلکچوئل لوگوں کی جعلی زبان سے بہت تنگ ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ممتاز کی طرف چلنا نہیں ہے۔ وہ سالا تمہیں گالیاں دے رہا ہوگا۔"

"چلتے ہیں یار، چائے تو پی لیں۔" میں اٹھ کر اندر گیا۔ زبیدہ سے چائے کی فرمائش کی۔ پھر کامریڈ کے پاس آبیٹھا۔ چائے بھی جلدی ہی آگئی اور چائے بھی جلدی ہی آگئی اور چائے پیتے پیتے پھر میں پٹڑی سے اتر گیا۔ پھر وہی یادیں اور باتیں اور میں سوچنے لگا کہ میں اس وقت آج سے کتنا مختلف تھا۔ جیسے وہ آدمی ہی کوئی اور تھا، اب میں نے دھیان ہی دھیان میں اپنے اس روپ کو ایسے یاد کیا۔ جیسے وہ کوئی اور

شخص تھا، مجھ سے بہتر مجھ سے برتر۔

"رحمت، میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا"

"نہیں صاب جی"

اب یہ سوال اس کا معمول بن گیا تھا۔ دفتر میں داخل ہو کر اپنی نشست پہ بیٹھا گھنٹی بجا کر رحمت کو بلایا۔ پہلا سوال "میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا" اور رحمت کا بندھا ٹکا جواب "نہیں صاب جی"۔ بے اعتنائی کے دن کتنی جلدی گذر گئے۔ بے چینی کے دن کتنی تیزی سے واپس آئے اور پہلے کی نسبت کتنی زیادہ شدت کے ساتھ واپس آئے۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اُسی کا دھیان وہی ایک آواز نرم شیریں اس کے سامعہ میں گونجتی رہتی اور اب یہ پہلے کی طرح محض آواز نہیں تھی اس کے ساتھ ایک چہرہ بھی جڑ گیا تھا۔ وہ صورت جس سے وہ اتنا بیزار رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے دل و دماغ میں کھبتی چلی گئی۔ اسی حساب سے دلکش ہوتی چلی گئی۔ اب وہ پیکر اس ساعت کے ساتھ جب وہ کافی ہاؤس میں اس کی تلاش میں داخل ہوئی تھی اس کے تصور میں کنارچ بس گیا تھا۔ وہ چھریرا بدن، وہ سانولی صورت۔ وہ گھبرائے گھبرائے لہجہ میں پوچھنا "آپ ہیں اخلاق صاحب" اور پھر سٹپٹا جانا۔ اس نے اپنے آپ پر کتنی ملامت کی کہ اسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ تھوڑا اصرار کیا جاتا تو وہ ضرور رک جاتی۔ نہیں رکی، مگر اس کے بعد فون تو کرتی۔ فون اس نے پھر کیوں نہیں کیا۔ کتنی بار دل ہی دل میں یہ سوال اس نے دہرایا۔ میز پہ رکھا ہوا ٹیلی فون اب اسے کتنا بے معنی نظر آنے لگا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں تک جب اس کے فون آیا کرتے تھے تو یہ ٹیلی فون اس کے لئے ایک زندہ شے تھا۔ فون کی گھنٹی بجتی تو واقعی بولتا ہوا لگتا، جیسے اُسے پکار رہا ہے۔ اب وہ محض ایک مشین تھا۔ ایک ٹھیکرا جس نے میز پہ خواہ مخواہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ پھر ہار جھک مار کر رحمت سے سوال "میرے پیچھے کسی کا فون تو نہیں آیا"

"نہیں صاب جی"۔ اور عین لنچ کے وقت بیقرار ہو کر اٹھ کھڑے ہو نا۔ کافی ہاؤس ایسے پہنچنا جیسے ملاقات کا وقت ٹھہرا ہوا ہو۔

"شرافت صاحب وہ لڑکی پھر تو نہیں آئی؟"

"نہیں"۔

"عجب لڑکی ہے"۔ بڑبڑانا اور چپ ہو جانا۔

روز وہی ایک سوال۔ نفی میں جواب سننا، بڑبڑانا اور چپ ہو جانا۔ آخر شرافت صاحب کی زبان کھل گئی "اخلاق صاحب، آپ اس لڑکی کے لئے بہت پریشان نظر آتے ہیں"۔

"نہیں پریشان تو میں نہیں ہوں مگر ——" کچھ کہنا چاہتا تھا، پتہ نہیں کیا۔

"اسے بینک ہی میں جا کر کیوں نہیں مل لیتے"۔

"بینک میں؟" وہ چونکا جیسے ہاتھ سے نکل ہوئی ڈور کا سرا مل گیا ہو "مجھے تو پتہ نہیں کونسے بینک میں کام کرتی ہے"۔

"واہ اخلاق صاحب، یہ بھی ہم ہی بتائیں آپ کو"۔

"شرافت صاحب، آپ کمال کرتے ہیں۔ میں کونسا اس لڑکی سے عشق کر رہا ہوں کہ اس کا پتہ نوٹ کرتا۔ وہ خود ہی اپنا پین میرے دفتر میں آ کر چھوڑ گئی۔ بس اس کی سزا بھگت رہا ہوں"۔

"تو اس روز پین لے کر نہیں گئی ہے"۔

"وہ تو خیر لے گئی تھی۔ لیکن ——" سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے اور بات کیسے بنائے۔

"ٹھیک ہے اخلاق صاحب ٹھیک ہے۔ مگر وہ آپ سے تو بہت قریب ہے۔ آپ کے دفتر کے پاس کمرشیل بینک ہے نہیں"۔

"ہاں ہاں"

"وہیں کام کرتی ہے"

وہ حیران رہ گیا۔ کہاں کہاں اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا۔ وہ تو بالکل اس کے بغل میں بیٹھی ہوئی ہے۔

"وہاں اس کا پتہ کیسے چلے گا"

شرافت صاحب بہت ہنسے "کمال ہے اخلاق صاحب آپ تو بہت ہی سیدھے آدمی ہیں۔ کسی سے پوچھ لیجئے کہ ذکیہ احمد کدھر بیٹھتی ہے۔ پہلے تو وہ ادائیگیوں کے کاؤنٹر پہ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب جو میں پچھلے ہفتے چیک کیش کرانے گیا تھا تو وہاں وہ نظر نہیں آئی" رک کر "لنچ ٹائم ختم ہو رہا ہے۔ اس وقت وہ مل جائے گی"

"نہیں مجھے اتنی عجلت نہیں ہے" اس کے ساتھ ہی اس نے کافی کا ہی آرڈر دے دیا۔ وہ ایسے جتا رہا تھا جیسے وہ اس وقت ادھر جانے کی کوئی نیت نہیں رکھتا۔ اطمینان سے کافی پیتا رہا۔ دیر بعد اٹھا۔ اطمینان سے وہاں سے نکلا۔ لیکن باہر نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ چلا کمرشیل بینک کی طرف۔ چل کیا رہا تھا۔ دوڑ رہا تھا۔ کتنی جلدی جلدی اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ اس کا بس چلتا تو اڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔

"دیکھئے یہاں ذکیہ احمد کس طرف بیٹھتی ہیں" پہلے ہی کاؤنٹر۔ جو اسے نظر آیا اس پر سوال داغ دیا۔

"ذکیہ احمد، وہ تو اب یہاں نہیں ہوتیں"

"جی، وہ یہیں ہوتی ہیں"

کاؤنٹر پہ بیٹھے کلرک نے اڑتی سی ایک نظر اس پر ڈالی "ہوتی تھیں۔ یہاں

سے ان کا ٹرانسفر ہوگیا۔"

"ٹرانسفر؟" اس پہ اوس پڑ گئی "اچھا؟" سوچ میں پڑ گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اُس نے حوصلہ پکڑا۔ "آپ بتا سکتے ہیں کہ کہاں ٹرانسفر ہوا ہے؟"

کاؤنٹر کلرک نے کہ اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا بڑی بے دلی سے رجسٹر سے نظریں اُٹھائیں۔ قریب بیٹھے ہوئے کلرک سے پوچھا "یار مس احمد کونسی برانچ میں گئی ہے؟"

"چھوٹی مارکیٹ والی برانچ ہیں۔"

"شکریہ"۔ بس وہ فوراً ہی پلٹ لیا۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا چھوٹی مارکیٹ کی طرف بازار کی وہ بھیڑ وہ ٹریفک اس کیلئے کس قدر بے معنی بن گیا تھا۔ چوراہے پر پہنچ کر اس نے سبز سرخ بتی کا لحاظ کئے بغیر کتنی تیزی سے سڑک کو عبور کیا۔ کتنی تیزی سے بینک کی عمارت میں داخل ہوا۔

"دیکھئے، یہاں ذکیہ احمد ہوتی ہیں؟"

"ذکیہ احمد؟" کاؤنٹر پہ بیٹھا کلرک اس نام سے آشنا نظر نہیں آتا تھا۔ قریب والے سے پوچھا "یار ذکیہ احمد کون ہے؟"

"مس احمد۔ ہاں وہ نئی نئی آئی تھی۔ مگر آتے ہی اُس نے چھٹی کی درخواست دے دی۔" پھر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "مسز وہ تو لانگ لیو پر ہیں۔"

"لانگ لیو پر؟" جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔

"یار چائے ختم کرو نا" کامریڈ کی آواز۔

"ہوں" اور ایک دم سے پھر میں اپنے صیغہ میں تھا۔ "ہاں یار میں واقعی دور چلا گیا تھا" اور میں نے سوچا کہ وہ دن اب واقعی کتنی دور چلے گئے ہیں۔

میں اب اسے اس طرح یاد کیوں نہیں کرتا۔ اب تو وہ بس ایک خوشگوار لیکن

جامدسی یاد بن کر رہ گئی ہے۔ میں اب اسے یاد کر کے نہ بیتاب ہوتا ہوں نہ اذیت محسوس کرتا ہوں۔ اس یاد میں بے تعلقی کا رنگ کتنا آگیا ہے۔ ان دنوں وہ تصور میں کتنی زندہ تھی۔ ہر دم ایک خیال کہ اب فون کی گھنٹی بجی اور اب اس کی آواز آئی اور میں کتنا بے قرار پھرتا تھا۔ ہر دم ایک دیوانگی طاری رہتی۔ کسی کے ساتھ وابستگی بھی آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ بس جیسے جون بدل گئی ہو۔ مگر شاید آدمی کی اصلی جون وہی ہوتی ہے۔ یا شاید میری اصلی جون وہی تھی۔ وہ دیوانگی کیا گئی کہ میں بھی چلا گیا۔ اب میں کہاں ہوں۔ اپنے گھر اور گھر والی کے ساتھ کھاتی پیتی زندگی بسر کرنے والا ایک دنیادار آدمی۔ یہ بھلا میں ہوں۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ میں تو وہ تھا جو اُس وقت تھا۔ اب میں کوئی اور ہوں۔ جعلی میں "چل اُٹھ کامریڈ" میں اپنے جعلی میں سے خائف فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ممتاز یار، تم تو بہت بے مروت نکلے۔ کتنے دن تمہیں آئے ہوئے ہو گئے۔ آنے کے بعد اپنی رسید تو دی ہوتی۔"

"مت پوچھو یار، آنے کے بعد مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ اب کہیں جا کر تھوڑا اطمینان کا سانس لیا ہے۔ کامریڈ سے کتنی مرتبہ کہا کہ اخلاق کی طرف چلنا ہے۔ مگر اس کی تو اپنی موج ہوتی ہے۔"

"جانے بھی دے یار، کیوں گپ ہانک رہا ہے۔"

"اچھا خیر اور سناؤ۔ میرے ہوتے ہوئے تم مکان بنانے کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب کیا حال احوال ہے۔"

"یار ہم تو مکان بنا کے مشکل میں پھنس گئے۔"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"یار ہاؤس بلڈنگ والوں کا قرضہ تو بڑی جان لیوا چیز ہے۔ میں مہینے کے مہینے باقاعدہ قسط ادا کرتا ہوں۔ اس کے باوجود نوٹس آگیا کہ اتنی رقم پندرہ دن کے اندر اندر ادا کرو ورنہ مکان نیلام کر دیا جائے گا۔ میری بیوی کے تو ہوش اُڑ گئے۔"

فاروق نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ "ہر مہینے قسط دیتے ہو؟"

"ہر مہینے طے شدہ تاریخ پر۔ ایک دن اِدھر نہ ایک دن اُدھر۔"

"سن رہے ہو ممتاز؟" اُس نے ممتاز کو مخاطب کیا۔ "یہ میرا یار مہینے کے مہینے باقاعدگی سے قسط ادا کرتا ہے۔"

"کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔" ممتاز بولا۔ "اخلاق کو تم جانتے نہیں ہو۔ اس سے تم اور کیا توقع کر سکتے ہو۔"

"پھر اُستاد شکایت کس بات کی کرتے ہو۔ مشکل کو تو تم نے خود دعوت دی ہے۔ ہم نے بھی مکان بنایا ہے اور تم سے زیادہ لمبا قرضہ لیا ہے۔ آج تک تو کوئی قسط ادا کی نہیں ہے۔"

"کوئی نوٹس نہیں آیا؟" میں نے تعجب سے فاروق کو دیکھا۔

"نہیں۔"

"اکٹھا آئے گا۔"

"بیشک آجائے۔"

"بہت سود دینا پڑ جائے گا۔"

"پہلے وہ اصل تو مجھ سے وصول کر لیں۔"

"کیا فراڈ کیا ہے تم نے؟"

"بس طریقے ہوتے ہیں۔ آدمی اگر مکان بنائے تو اسے یہ طریقے بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ ورنہ مکان تو پھر آدمی کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔"

"یار پھر ہمیں بھی یہ طریقے بتائے ہوتے۔ یہاں تو روز یہی رہتا ہے۔ آج بلدیہ والوں کی طرف سے نوٹس۔ پرسوں کسی نجی قرض دینے والے کا تقاضا۔"

فاروق اس پر بہت ہنسا۔ کہنے لگا۔ "اُستاد ہماری شاگردی کرو۔ پھر ہم تمہیں قرضوں سے بچنے کے گر بتائیں گے۔"

میں پریشان ہو کر کبھی فاروق کو دیکھتا تھا۔ کبھی ممتاز کو۔ دونوں اس وقت مجھے کتنے دانا بینا نظر آرہے تھے اور کامریڈ۔ وہ اس گفتگو سے لاتعلق سگریٹ پینے میں مگن تھا۔ آخر بولا "یار باتیں ہی کئے جاؤ گے۔ وہ سالی چائے شائے کہاں ہے۔"

"کامریڈ۔ تھوڑا صبر، آرڈر دیا ہوا ہے۔" ممتاز نے اسے دلاسہ دیا۔

"خالی چائے کا آرڈر؟"

"اور کیا چاہتا ہے یار۔"

"کامریڈ، اتنے بڑے ہوٹل میں لاکے بٹھا دیا اور خالی چائے پہ ٹرخاؤ گے۔ وہ سالے تم شیوخ کے بوٹ چاٹ کے جو دولت کما کے لائے ہو اس میں سے کبھی فقیروں پر بھی خرچ کیا کرو۔"

میں نے کامریڈ کو رشک سے دیکھا "یار کامریڈ، تم مزے میں ہو۔ نہ غمِ دنیا نے غم کالا۔ نہ شادی کی نہ مکان بنایا۔"

"مکان؟" کتنی تحقیر تھی کامریڈ کے لہجہ میں۔ "آدمی نے مکان بنایا اور کام سے گیا۔" اور اس کے ساتھ ہی اُسے اپنی پارٹی کے کامریڈ یاد آگئے۔ "سالوں نے پلاٹ الاٹ کرائے اور مکان بنالئے۔ کوٹھیاں بنگلے، موٹر کار، بیوی۔ دلے کے بچے چلے تھے انقلاب لانے کے لئے۔ تھوڑا رُک کر۔ "وہ سالا اپنا کامریڈ خورشید بھکر چھوٹے

اور ایک تندوری روٹی، یہ اس کا نان قورمہ ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی بس ایک بند ایک چائے کا کوپ۔ مگر اب پورچ میں دو دو کاریں کھڑی رہتی ہیں۔ ایک کار صرف بچوں کو سکول سے لانے لے جانے کے لئے ہے۔ سالا انقلابی بنتا تھا"۔

"کامریڈ ظہور؟" میں نے لقمہ دیا۔

"کامریڈ ظہور"، کتنا منہ بگاڑ کر کامریڈ نے اس کا نام لیا۔ "اس کا سوشلزم تو کتابوں کے نیچے دب کر رہ گیا۔ پتہ ہے۔ میرے یار کا کیا پروگرام ہوا کرتا تھا۔ صبح ہی صبح ڈنڈ پیلے اٹھک بیٹھک کی۔ پھر لسی کا یہ لمبا گلاس غٹا غٹ چڑھایا۔ پھر مارکس کو لے کے بیٹھ گیا اور اس کے بعد وہ سالا فرانس کا بورژوا شاعر بادلیئر۔ ڈنڑ، لسی کا گلاس مارکس، بادلیئر۔ بھلا پوچھو ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ میں نے کہا کہ کامریڈ، اس وقت ہمیں کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔

انقلابی ایکشن کی ضرورت ہے۔ کہنے لگا کہ میں نے ایک انقلابی نظم لکھی ہے۔

میں نے کہا کہ دفعہ ہو، اس سالی تمہاری شاعری نے تمہیں بے عمل بنا دیا ہے"۔

میں نے کہا کہ "کامریڈ، کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس غریب نے کونسی غزل کہی تھی۔ انقلابی نظمیں ہی تو لکھی تھیں"۔

"ہوں انقلابی نظمیں۔ پانی میں چار قطرے دودھ کے ڈال دیئے جائیں تو وہ دودھ بن جائے گا۔ رہے گا تو پانی ہی۔ یہ سالی شاعری، ادب، یہ سب بورژوائی چکر ہے۔ لفظ، لفظ، لفظ، کامریڈ انقلاب میں تو کوئی کام دکھاتی ہے۔ لفظوں سے تو پٹلی بھی نہیں پھوٹتی اور ہمارے گریٹ کامریڈ سید صاحب کی سنو"، کامریڈ کو اسی رو میں کامریڈ سید کلب حیدر کا خیال آگیا۔ "مشرق وسطیٰ میں بادشاہوں کے تختے اُلٹ رہے تھے، امریکی سامراج کا جنازہ نکل رہا تھا۔ میں گیا سید صاحب کے پاس کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ بتانے لگے کہ آج کل میں داغ پر کام کر رہا ہوں۔

میں نے حیران ہو کے کہا کہ وہ رنڈیوں کے کوٹھوں کا شاعر۔ انقلاب سے اس کا کیا تعلق ہے۔ سید صاحب مسکرائے۔ بولے، اس پر بات کریں گے۔ اس وقت تو ہم مجلس میں جا رہے ہیں مجلس، میں ہکا بکا رہ گیا۔ بولے کہ ہاں قبلہ و کعبہ نقن صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ سید صاب، یہ مذہب کا جو بھمبل بھوسا ہے۔ بات کاٹ کے بولے، نہیں بھائی، یہ مذہب نہیں کلچر ہے۔ میں نے جل کے کہا کہ سید صاب، یہ تو لکھنؤ کا DECADENT کلچر ہے۔ اس کا دھرتی کے VIRILE کلچر سے کیا تعلق ہے۔ سید صاب جھینپ گئے۔ مسکرا کے بولے کہ کامریڈ آج تم انگریزی میں بہت رواں ہو۔"

"یار کامریڈ، بس کر، تقریر بہت لمبی ہو گئی۔" آخر ممتاز نے بیزار ہو کر کہا۔

"انقلاب کی رام کہانی بہت ہو گئی۔ اب کوئی اور بات ہونی چاہیئے۔" فاروق نے تائیدی لہجہ میں کہا۔

مگر کامریڈ تو خود ہی چپ ہو گیا تھا۔ ایک دم سے چپ اور پھر جیسے گہرے خیال میں ڈوب گیا ہو۔ پھر لمبا ٹھنڈا سانس بھرا۔ "پارٹی میں بس ایک نگ تھا۔ دادا منصور۔ کیا نر آدمی تھا۔ لینن بھی اس کا لوہا مانتا تھا۔"

"لینن؟" ہم سب چونکے اور محظوظ ہوئے۔

"ہاں لینن۔ دادا کی لینن سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر بعد میں لینن نے دادا کو خط بھی لکھا تھا۔ ان سالوں میں سے کسے لینن نے گھاس ڈالی تھی۔ یہ اس کے سامنے جاتے تو ان کی تو گھگھی بندھ جاتی اور لینن بھی انہیں ٹھڈے مار کے نکال دیتا کہ دفع ہو جاؤ، دلو کے بچو۔ تم لاؤ گے انقلاب یار تم نے دادا کو دیکھا تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا۔" ممتاز نے کہا "خل خل اچکن، بٹن اوپر سے نیچے تک کھلے ہوئے، ملا دلا پائجامہ۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔"

"بالکل ٹھیک" کامریڈ نے تصدیق کی "بالکل یہی حلیہ تھا۔ وہ تو فقیر آدمی تھا ان میں سے کس نے ایسی درویشانہ زندگی گذاری ہے"

"یار وہ زمانہ ہی ایسا تھا" ممتاز کہنے لگا "لوگوں میں ابھی درویشی باقی تھی۔ ایک دفعہ کی سنو، رات کے کوئی تین بجے ہوں گے۔ میں میرڈ سے کیمرے دیکھ کر اپنی سائیکل پہ گھر جا رہا تھا۔ لوہاری دروازے کی طرف سے گذرا۔ یہاں سے وہاں تک اندھیرا۔ فٹ پاتھ پہ ایک چائے والا بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد تانگے والے بیٹھے پیالوں میں چائے پی رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بیچ میں ناصر کاظمی بیٹھا ہے اور رواں ہے۔ میں حیران کہ یار ابھی تو یہ بندہ میرڈ میں اینجلا کا کیمرے دیکھ رہا تھا۔ ابھی مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔ کیا اڑ کر آیا ہے"

"اینجلا۔ واہ سبحان اللہ" فاروق بیساختہ بولا۔

"بس اس کے جانے کے ساتھ یہ شہر ویران ہو گیا"

کامریڈ نے جھرجھری لی "کامریڈ، عورت اس شہر میں بس ایک تھی۔ تم سالوں نے دادا کو نہیں دیکھا۔ اسے کہاں دیکھا ہو گا"

"کون تھی بے" فاروق نے پوچھا۔

کامریڈ نے کانوں کے قریب منہ کر کے اس کا نام لیا۔ فاروق نے فوراً تردید کی "نہیں یار۔ آج کل تو میں روز اُسے دیکھتا ہوں"

"اب اسے کیا دیکھنا ہے۔ ان دنوں دیکھا ہوتا۔ میں یوں تو انجمن کے جلسوں میں جاتا نہیں تھا۔ سالوں کو انقلاب کے لئے جو ورک کرنا چاہیئے تھا وہ تو کرتے نہیں تھے۔ ادب پہ بے فضول بحثیں کرتے رہتے تھے۔ بس اسے دیکھنے کے لئے میں اِدھر جا نکلتا تھا۔

"یار ہم میں سے کسی نے قائدِ اعظم کو بھی دیکھا تھا" ممتاز نے اچانک سوال

اُٹھایا۔" اخلاق، تم نے تو دیکھا ہوگا؟"

"نہیں یار۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے ساتھ فیلڈ مارشل ایوب خاں ہی کو دیکھا۔ پھر یحییٰ خاں کو دیکھا۔ پھر ——"

"مگر دادا منصور کو نہیں دیکھا؟" کامریڈ نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"کامریڈ، تم نے دادا کو دیکھ لیا ہوتا تو آج تم اتنے بے فضول قسم کے رجعت پسند نہ ہوتے۔"

"یار وہ زمانہ اچھا تھا۔" ایک مرتبہ پھر اس زمانے کو ممتاز نے ایک ٹوسٹلجیائی کیفیت کے ساتھ یاد کیا۔

"بس جب تک دادا زندہ رہے۔ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ہمارا تو بیٹھا بیٹھ گیا۔ سالا زمانہ ہی بدل گیا۔"

"کامریڈ، اب کونسا زمانہ جا رہا ہے؟"

"یار یہ پوچھو کہ کونسا زمانہ آنے والا ہے۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"بھنبھل بھوسا۔"

"اور کامریڈ، تمہارا انقلاب؟"

"انقلاب کون لائے گا۔" فاروق نے طنزیہ کہا "سالے تمہارے کامریڈوں نے تو سوشلزم کو بیچ کھایا۔"

"کامریڈ، تم مت بولو۔"

"کیوں نہ بولوں۔" فاروق نے تھوڑی برہمی سے کہا۔

"اس لئے کہ تم اسلام کو بیچ رہے ہو۔"

فاروق فوراً ہی گرم ہو گیا۔

"کامریڈ اس میں گرم ہونے کی کیا بات ہے" کامریڈ نے فوراً ہی ٹکڑا لگایا "یہ تو اپنا اپنا کاروبار ہے"

دونوں میں گرمی سردی ہونے لگی تھی۔ میں نے اور ممتاز نے تو تھمیو کی تب کہیں جا کر دونوں چپ ہوئے ورنہ اس شام کا مزہ بالکل ہی کرکرا ہو جاتا۔ مزہ کرکرا یوں بھی ہوا۔ اس کے بعد فاروق جتنی دیر بیٹھا اکھڑا اکھڑا رہا۔ جو بات کی تلخی کے لہجہ میں کی۔ آخر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں جا رہے ہو؟"

"ہاں یار، اس وقت میں موڈ میں نہیں ہوں"

میں نے بہت احتجاج کیا "یار اتنے دنوں بعد تو ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی اکھڑنے کی نہیں ٹھہری تھی۔ میں تو ایک بھرپور رتجگے کی نیت سے آیا تھا"

"تم رتجگا کرو۔ کون روک رہا ہے۔ مگر میری طبیعت رتجگے کے لئے حاضر نہیں ہے"

اس کے بعد ہم تینوں نے اس بات کو یکسر نظر انداز کر کے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔

کامریڈ چائے کی فرمائش سے شروع ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے کر کے وہ ممتاز کو ڈنر تک لے آیا "کامریڈ، اب تو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کچھ کھایا پیا جائے"

"کھا لے یار جو کھانا ہو"

"یوں نہیں پورا ڈنر ہو گا"

ممتاز نے کامریڈ کی یہ تجویز بھی مان لی مگر پھر بھی سبھا جس طرح جمنی چاہیئے تھی۔ جم نہیں سکی۔ گئے دن واپس نہیں آیا کرتے اور جو سبھا ایک مرتبہ اکھڑ جائے وہ دوبارہ

نہیں جا کرتی۔ ہم کھانا کھانے کے بعد ہوٹل سے نکل لئے کہ باہر کی تازہ ہوا اور رات کی ٹھنڈک کے اثر سے طبیعت رواں ہو گی۔ یہ ہمارا آزمودہ نسخہ تھا۔ ان دنوں یہی ہوتا تھا۔ کافی اور چائے پی پی کر جب ہم حال سے بے حال ہو جاتے اور ادھر کافی ہاؤس بھی بند ہونے لگتا تو ہم نکل کھڑے ہوتے۔ بے طے کئے کہ کدھر جانا ہے اور کہاں جا کر ڈیرا کرنا ہے۔ اپنی لہر میں کبھی اس راہ کبھی اس راہ۔ کبھی لمبے فٹ پاتھ پر اہلے گہلے، کبھی بیچ سڑک پر خراماں خراماں رات بھیگنے کے ساتھ ٹریفک یوں ہی چھدرا ہوتا چلا جاتا، رفتہ رفتہ نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ دکانیں یہاں سے وہاں تک بند۔ منور کھمبوں تلے جگمگ جگمگ کرتی خالی خاموش سڑک۔ فٹ پاتھ پر کچھ اندھیرا کچھ اُجالا۔ ذرا موڑ مڑے تو منور کھمبے غائب۔ جیسے شہر بے چراغ میں چل رہے ہیں۔ کسی مقفل دکان کے آگے سڑک کے کنارے کوئی پان سگریٹ والا اپنی ٹمٹماتی دھوئیں سے رچی لالٹین کی روشنی میں اونگھتا جاگتا کسی شب بیدار گاہک کا منتظر۔ آگے تھوڑا اندھیرا۔ پھر موڑ آتے ہی روشنی کا ایک جزیرہ کہ بازار یہاں جاگتا ہے۔ گویا دن نکلا ہوا ہے۔ کوئی پان سگریٹ کوکا کولا کی رنگ برنگی دکان کوئی تکے کباب کا ہوٹل، کوئی چائے خانہ دھوئیں سے اور چائے کے دھتیوں سے بھرا ہوا، فلمی ریکارڈوں کے شور سے گونجتا ہوا۔ آگے چار قدم چل کر پھر اندھیرے کا دور دورہ۔ خاموشی کا ڈیرا۔ خالص رات کا ظہور۔

"یار میں چلا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے ممتاز کو تعجب سے دیکھا۔

ممتاز نے کلائی پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ بولا "یار بات یہ ہے کہ اس وقت ایک اوورسیز کال آنی ہے۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا چاہیے۔"

"سالے تم تو پکے بزنس مین ہو گئے۔"

"بھائی زندگی میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

اور مزید بحث میں اُلجھے بغیر ممتاز تیزی سے ہوٹل کی طرف چلا۔ کار میں بیٹھا اور تیزی سے ہمارے قریب سے موٹر نکال کر لے گیا۔ ہمارا آزمودہ نسخہ اپنی تاثیر کھو بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ رات کا جادو ان راتوں تک تھا۔ دنوں کی طرح راتوں کی رنگت بھی تو اب بدل چکی تھی۔ ابھی تک ٹریفک کی اتنی ہی ریل پیل تھی۔ اتنا ہی بے ہنگم شور رکشاؤں کا سکوٹروں کا، بھاری بھر کم ٹرکوں کا۔ اس شور نے کوک بھی اطمینان سے نہیں پینے دیا۔ اس پر دکان میں ڈسکو کے کیسٹ کا شور مستزاد۔

"ہاں یار، اب چلنا ہی چاہیے" پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "فراڈیا۔ سمجھتا ہے کہ کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے"

"کسے کہہ رہے ہو؟"

"فاروق کو اور کسے" اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

"شکر ہے تمہیں گھر واپس آنا یاد تو آیا"

"زبیدہ ایسی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔ مگر اتنے دنوں بعد چار دوست اکٹھے ہوئے تھے۔ بہت جلدی بھی واپس نہیں آیا جا سکتا تھا"

"ہاں تم تو وہاں دوستوں کے ساتھ بے فکر بیٹھے ہو گے۔ یہاں میرے دل میں ہولیں اُٹھ رہی تھیں"

"ہولیں اُٹھ رہی تھیں؟ —— وہ کیوں؟ —— شہر کے حالات ابھی اتنے تو خراب نہیں ہوئے ہیں"

بوجان کہ نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں تسبیح اور دعا سے اک عجلت کے ساتھ

فارغ ہو کر آئیں اور جلدی سے زبیدہ کو ٹوکا "بس بھی کرو دلہن۔ پھر وہی ذکر لے بیٹھیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں "اللہ بُری گھڑی سے بچائے رکھے اور دلہن سے تو میں نے کتنی مرتبہ کہا کہ دلہن جب دونوں وقت مل رہے ہوں تو انگنائی میں کھلے سر مت پھرا کرو اور آج تو ویسے بھی جمعرات تھی۔ بھلا پچھواڑے والی دیوار کی طرف جانے اور اس طرف جھانکنے کی کیا ضرورت تھی"۔

"کیوں، کیا بات ہوئی" میں نے چکرا کر بوجان کو اور پھر زبیدہ کو دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ سب دلہن کا وہم ہے"۔

"بوجان، آپ اسے وہم کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے"۔

میں حیران "کیا دیکھا ہے آنکھوں سے"۔

بیگم کچھ کہنے لگی تھی کہ بوجان نے بیچ میں بات کاٹی "اے دفع کرو دلہن۔ رات زیادہ ہو رہی ہے۔ جاؤ آرام کرو۔ جو بات کرنی ہے صبح کو کرنا"۔

بوجان نے ہمیں ہمارے کمرے میں دھکیلا۔ خود جانماز کی چوکی پر جا کر جانماز لپیٹنے لگیں۔

بستر میں آرام سے لیٹنے کے بعد میرے پوچھنے پر زبیدہ نے رکتے رکتے ڈری سی آواز میں اپنی واردات سنائی "میں نے پچھواڑے والی دیوار کے اِدھر جو جھانکا تو نظر وہاں جا پڑی جہاں پھانسیاں پڑی تھیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ برابر برابر تین آدمی کھڑے ہیں۔ یہ لمبے، بانس کے بانس۔ سفید کفنیاں پہنے ہوئے اور جیسے انہوں نے تاڑ لیا ہو کہ میں ان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ میرا دم ہی تو نکل گیا۔ بھاگی چیخ مار کے بوجان گھبرا کے باہر نکل آئیں۔ کیا ہوا دلہن۔ میری تو گھگھی بندھ گئی۔ بوجان نے قرآن کی ہوا دی۔ آیتہ الکرسی پڑھ کے دم کیا، تب کہیں مجھے ہوش آیا۔ نہیں تو میں گئی تھی"۔